مجید امجد کی نظم ''ہڑپے کا ایک کتبہ''
کا تنقیدی مطالعہ

آصف علی چٹھہ☆

Abstract

Majeed Amjad is one of the most prominent modern Urdu poets. He is famous for his unique style, variety of topics and diction. With his vision and observation, he infers vast meanings and conclusions from common experiences of life in the third world, especially this part of Asia. His poetry reveals how our system supports social inequality and exploitation and promotes privileged class. This article studies Majeed Amjad's lamentation of the miserable plights of peasants. He expressed his grief in one of his poems in which he criticized the so-called flag bearers of human rights very aptly.

بہتی راوی تیرے تٹ پر کھیت اور پھول اور پھل
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کے چھل بل
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی اک ہالی اک ہل

سینۂ سنگ میں بسنے والے خداؤں کا فرمان
مٹی کاٹے مٹی چاٹے ہل کی انی کا مان
آگ میں جلتا پنجر ہالی کاہے کو انسان

☆ لیکچرار شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ

کون مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ
ہل کو کھینچنے والے جنوروں ایسے اس کے لیکھ
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں تین بیل ہیں دیکھ

حضرت عمر فاروقؓ کا یہ فرمان کہ لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا تم نے کب سے ان کو اپنا غلام بنا لیا ہے یا فرانسیسی مفکر روسو (Rousseau) کا یہ کہنا کہ انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن جہاں دیکھو زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے، انسانی تاریخ کی ایک تلخ حقیقت کا اظہار ہے۔ اسی حقیقت نے معاشرے میں طبقاتی کشمکش کو جنم دیا۔ یوں نتیجتاً کم و بیش ہر دور کے معاشرے میں دو طبقات ضرور موجود رہے ہیں۔ ایک طبقۂ امرا اور دوسرا طبقۂ غرباء۔ ایک وسائل سے مالامال اور وسائل پر قابض۔ دوسرا وسائل سے محروم اور محکوم یا جنہیں جدید دور میں بورژوا (Bourgeois) اور پرولتاری (Proletarian) کا نام بھی دیا گیا۔

چوں کہ ابتدا ہی سے انسانوں کا زیادہ تر ذریعۂ معاش زراعت رہا ہے۔ اسی لیے شروع ہی سے استحصالی اور استحصال زدہ کردار جاگیردار اور کسان کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ کسان وہ مزدور ہے جس کی اپنی کوئی اوقات ہے نہ اس کی مزدوری کے کوئی اوقات متعین ہیں۔ وہ صبح سے لے کر شام تک اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے، لیکن شام کو خالی ہاتھ گھر لوٹتا ہے۔ جاگیردار تو کسان کی محنت کی بدولت ریشم و اطلس زیبِ تن کرتا ہے، لیکن کسان کا لباس تار تار ہی رہتا ہے۔ کسان کی مشقت کے باعث زمین سونا اُگلتی ہے لیکن اس کی اپنی حالت اقبالؔ کے الفاظ میں کچھ یوں ہی رہتی ہے:

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مُردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے (۱)

یوں فیض احمد فیضؔ کا یہ "بادشاہِ جہاں، والیٔ ماسوا، نائب اللہ فی الارض" دہقان صدیوں سے اسی ظلم اور جبر کی چکی میں پستا نظر آتا ہے۔ مجید امجد کی نظم "ہڑپے کا ایک کتبہ" بھی اسی استحصالی نظام کے خلاف تاسف اور احتجاج کا ایک فن کارانہ اظہار ہے۔

مجید امجد کے علاوہ ڈاکٹر تصدق حسین خالد کے ہاں بھی ''ایک کتبہ'' کے عنوان سے ایک نظم موجود ہے۔ نظم دیکھیے:

شیر دل خاں/ مَیں نے دیکھے تیس سال
پَے بہ پَے فاقے/ مسلسل ذلتیں
جنگ/ روٹی
سامراجی بیڑیوں کو وسعت دینے کا فرض
ایک لمبی جانکنی/ سو رہا ہوں اس گڑھے کی گود میں
آفتابِ مصر کے سائے تلے/ میں کنوارا ہی رہا
کاش! میرا باپ بھی (۲)

یہاں کتبہ سے مراد لوحِ مزار ہے لیکن حسنِ اتفاق ہے کہ اس نظم میں بھی احساسِ محرومی کی تیز کسک اور سامراج کے ظلم و استحصال کا گہرا ادراک موجود ہے۔ اسی طرح ''کتبہ'' کے نام سے غلام عباس کا معروف افسانہ بھی آرزوؤں اور حسرتوں کا ایک مرقع بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ انگریزی شاعری میں بھی Epitaph اور A Nameless Epitaph کے عنوان سے J.V. Cunningham اور Mathew Arnold کی نظمیں موجود ہیں لیکن یہ نظمیں ایک مختلف مزاج کی حامل ہیں اور ادب میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ متعدد شعرا نے ایک ہی عنوان پر اظہارِ خیال کیا ہے لیکن ان کے نقطۂ ہائے نظر ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ مثلاً انگریزی میں Snake کے عنوان سے Theodore Roethke, Emily Dickinson اور D.H. Lawrence کی نظمیں ملتی ہیں۔ Emily سانپ سے خوف محسوس کرتی ہے۔ Roethke کو سانپ کی خوبصورتی اتنا متاثر کرتی ہے کہ اُس کے دل میں خود سانپ بننے کی خواہش مچلتی ہے۔ I longed to be that thing. جب کہ Lawrence کے ہاں Snake ایک علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔(۳) بہر حال ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' منفرد خصوصیات کی حامل خوب صورت نظم ہے۔

۱۲/ اگست ۱۹۵۹ء کو لکھی جانے والی یہ نظم مجید امجد کے دوسرے مجموعۂ کلام ''شب رفتہ

کے بعد'' میں شامل ہے جو ان کی وفات کے بعد ۱۹۷۶ء میں منظرعام پر آیا۔ شبِ رفتہ کا سنِ اشاعت ۱۹۵۸ء ہے۔ یوں یہ نظم ان کے پہلے مجموعۂ کلام کے بعد لکھی جانے والی ابتدائی نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس وقت تک مجید امجد بہت سا ارتقائی سفر طے کر چکے تھے، چناں چہ یہ نظم مجید امجد کی شاعری کے مجموعی مزاج میں رچی بسی ہے اور ان کے گہرے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی شعور کی عکاس ہے۔

مجید امجد کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے الفاظ میں مجید امجد کا کلام تعداد اور معیار دونوں اعتبار سے دورِ حاضر کے اہم شاعروں سے بڑھ کر ہے۔ جتنا تنوع ان کے ہاں پایا جاتا ہے وہ اُردو کے کسی جدید شاعر میں موجود نہیں ہے۔(۴) لیکن ان کی شاعری میں جو چیز تقریباً ابتدا سے آخر تک ایک تسلسل کے ساتھ موجود ہے، وہ سامراجی اور استحصالی نظام کے خلاف نفرت کا اظہار ہے۔ مجید امجد نے اپنی نظم ''قیصریت'' ۱۹۳۹ء میں لکھی جس میں برطانوی سامراج اور شہنشائیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس نظم پر مجید امجد کو کیمونسٹ کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں نظم ''انقلاب'' لکھی جس میں وہ فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ'' کی طرح رومانویت سے حقیقت کی جانب اپنے سفر کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں:

ڈال رکھا تھا تخیل نے جو رنگیں پردا
رُخِ ہستی سے ہے اُٹھنے لگا رفتہ رفتہ
اب حقیقت میری آنکھوں کے قریب آتی ہے
نظر اب دنیا کی تصویر مہیب آتی ہے (۵)

۱۹۴۰ء کی نظم ''دنیا'' میں بھی ایک احتجاج کی صدا سنائی دیتی ہے:

یہ دنیا ہے میری کہ مرقد ہے میرا
یہاں بھی اندھیرا وہاں بھی اندھیرا (۶)

اپریل ۱۹۵۷ء میں مجید امجد نے اپنی نظم ''کہانی ایک ملک کی'' لکھی جس میں کسانوں

اور مزدوروں کے استحصال زدہ طبقے کے ساتھ اظہارِ ہمدردی ہے اور جاگیردارانہ ذہنیت اور نظام کے خلاف نفرت کا اظہار ہے۔ لکھتے ہیں:

راج محل کے اندر اک اک رتناسن پر
کوڑھی جسم اور نوری جامے،
روگی ذہن اور گردوں پیچ عمامے
جہل بھرے علامے
ماجھے گامے،
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے

اس نظم کے آخر میں لکھتے ہیں:

راج محل کے باہر سوچ میں ڈوبے شہر اور گاؤں
ہل کی انی، فولاد کے پنجے
گھومتے پہیے، کڑیل بانہیں
کتنے لوگ کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں
سکھ کی سیجیں،
لیکن جوہر راحت کو ٹھکرائیں
آگ پئیں اور پھول کھلائیں (۷)

بہر حال مجید امجد کے ہاں کئی ایسی اور بھی نظمیں نظر آتی ہیں جو اس امر کی غمازی کرتی ہیں کہ وہ ہر طاغوتی طاقت اور ہر ظالمانہ روایت کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہڑپے کا ایک کتبہ بھی اسی فکر کا تسلسل ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس نظم کی تخلیق سے تقریباً ایک سال قبل پہلا مارشل لا بھی وطن عزیز پر مسلط ہو چکا تھا، چناں چہ اس دور کے سیاسی حالات کے تناظر میں اس نظم کی اہمیت

میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر چہ مجید امجد دورانِ ملازمت مختلف شہروں میں مقیم رہے لیکن ان کا زیادہ عرصہ ساہیوال میں گزرا۔ لہٰذا امکان ہے کہ ہڑپے کی سیر کے دوران میں کسی کتبے کو دیکھ کر ان کا یہ احساس کسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ بیدار ہوا کہ کسانوں کا طبقہ کس قدر استحصال زدہ ہے۔ Wordsworth نے ایک جگہ کہا ہے:

"The voice which is the voice of my poetry without imagination cannot be heard."

شاعری میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ بعض اوقات کوئی معمولی سی چیز شاعر کے ذہن کو مہمیز لگاتی ہے اور اسے تخیل کی دوردراز وادیوں میں پہنچا دیتی ہے، چناں چہ قاری کو بھی اُسی جہان دگر میں محوِ سفر ہونا پڑتا ہے۔ John Keats کی نظم "Ode on a Grecian Urn" بھی ایسی ہی صورتِ حال کی غماز ہے اور ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' میں بھی یہی صورت ہے کہ ایک کتبے کو دیکھ کر شاعر کا تخیل تین ہزار سال قبل کی تہذیب کی طرف جست لگاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ یہ طبقاتی تضاد اور تفریق صدیوں سے موجود ہے۔ شاید اسی لیے کارل مارکس نے کہا تھا کہ پوری تاریخ انسانی طبقاتی کشمکش سے بھری پڑی ہے۔

مجید امجد کسی تحریک سے وابستہ نہیں تھے لیکن ان کے ہاں محکوم اور مجبور طبقے کا ساتھ دینے کا جو رجحان ملتا ہے وہ ان کو کسی حد تک ترقی پسندوں کے قریب کر دیتا ہے۔ پھر بھی اقبالؔ کی طرح مجید امجد کو بھی کسی تحریک کے ساتھ مکمل طور پر منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ زیرِ مطالعہ نظم بھی اس بات پر شاہد ہے کہ وہ کوئی مخصوص نعرہ لگاتے ہیں نہ کوئی پروپیگنڈا کرتے ہیں بلکہ بعض جگہ صرف منظر کشی سے مطلوبہ تاثر کو نمایاں کرتے ہیں۔

زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربات اور مناظر سے بڑے بڑے معنی اور نتائج اخذ کرنا مجید امجد کا وہ انداز ہے جو ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔ توسیع شہر، ایک کوہستانی سفر کے دوران اور پنواڑی وغیرہ کی طرح ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' میں بھی یہی صورت ہے کہ شاعر کی نظر ایک کتبے پر پڑتی ہے لیکن وہ اس سے ایک بڑی سچائی کو اخذ کر کے اپنے شاعرانہ تجربے میں اس انداز سے سموتا ہے کہ ماضی اور حال کے فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔

اس نظم کو مجید امجد نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے بند میں شاعر نے راوی کے کنارے خوب صورت پھولوں، پھلوں اور کھیتوں کا ایک منظر دکھایا ہے۔ جہاں ایک کسان بیلوں کی ایک جوڑی کے ساتھ مصروفِ کار ہے۔ اس بند میں شاعر نے تین ہزار برس پرانی تہذیب کے ساتھ چھل بل کے الفاظ سے یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ مظلوم کسان صدیوں سے جاگیرداروں کے فریب اور دھوکے کا شکار چلا آ رہا ہے اور یہ ظالمانہ نظام آج بھی ماضی کی طرح جاری و ساری ہے۔

دوسرا بند اس لحاظ سے معنی خیز ہے کہ اس میں شاعر نے منظر کشی بھی کی ہے اور جاگیرداروں اور ظالموں کے پرفریب عزائم کا پردہ بھی چاک کیا ہے۔ سینۂ سنگ اور خداؤں کا فرمان، کے الفاظ فکر انگیز ہیں۔ خداؤں کا لفظ مجید امجد نے ان فرعون صفت جاگیرداروں کے لیے استعمال کیا ہے جو نسل در نسل بدلتے رہتے ہیں لیکن جو اپنے ہر فرمان کو اٹل اور مقدس سمجھتے ہیں۔ جن کی حکم عدولی ان کے غیظ و غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور جو زمین کے ساتھ اس پر کام کرنے والی رعایا کو بھی اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ اقبالؔ نے بھی اپنی نظم ''الارض للہ'' میں جاگیردار کے لیے ''دہ خدایا'' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ مجید امجد نے کسان کو ہل کی انی کا مان کہا ہے جو آگ پیتا ہے اور پھول کھلاتا ہے۔ دوسرے بند کے تیسرے مصرع میں کسان کے لیے پنجر کا لفظ استعمال کر کے مجید امجد نے کسان کی مفلسی، غربت اور بے کسی کے المیے کو بہت گہرا کر دیا ہے کہ وہ آگ برساتے سورج کے نیچے ننگے بدن محنت کشی پر مجبور ہیں۔ شاید اسی موقع کے لیے اقبالؔ نے کہا تھا:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات(۸)

تیسرے بند کے پہلے مصرع میں خطیبانہ استفسار کے اندر مجید امجد کا وہ گہرا کرب اور دُکھ چھپا ہوا ہے جو ہر لحظہ ان کو بے چین اور بے قرار رکھتا ہے کہ صدیوں سے مظلوم دہقان کی تقدیر کون بدلے گا۔ کیا یہ بھی کبھی اشرف المخلوقات کے درجے پر پہنچے گا یا پھر یوں ہی جانوروں کی طرح اپنے آقاؤں کا حکم ماننے پر مجبور رہے گا۔ یہاں مجید امجد یہ سوال کرتے نظر آتے ہیں کہ: Liberty, Equality, Fraternity اور Bread, Peace, Land کے بلند بانگ دعووں

کے بنیاد پر آنے والے انقلابات بھی کسان کی قسمت میں تبدیلی کیوں نہیں لا سکے۔ تیسرے بند کے تیسرے مصرع میں جاگیردارانہ اور استحصالی نظام کے خلاف مجید امجد کا یہ احتجاج ایک نوحے کی صورت میں ڈھل جاتا ہے اور وہ پکار اُٹھتا ہے:

تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں، تین بیل ہیں دیکھ

یہاں کسان کو بھی بیل کہہ کر مجید امجد نے یہ پیغام دیا ہے کہ کسان بھی بیل کی طرح اس نظام کے جوئے میں جتا ہوا ہے۔ غلامی کا یہ جوا اُتارنا اس کے بس میں نہیں ہے کہ وہ زمیں پر خوش حالی کی لکیریں تو کھینچ سکتا ہے لیکن اپنے مقدر کی لکیروں کو بدلنے سے قاصر ہے بلکہ اگر ہم غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاعر یہاں خود بھی ایک بیل میں ڈھل گیا ہے کہ انسانی زندگی اپنی بے کسی اور بے بسی کے احساس کے باوجود بھی اس تقدیر کی اسیر ہے، کیوں کہ بہ قول غالبؔ:

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک(۹)

چناں چہ مجید امجد کی نظم ''کنواں'' کا یہ حصہ بھی ان کی اسی سوچ کا عکاس ہے:

جسے سُن کے رقصاں ہے اندھے تھکے ہارے بے جان بیلوں کا جوڑا بچارا
گراں بار زنجیریں، بھاری سلاسل، کڑکتے ہوئے آتشیں تازیانے
طویل اور منتہی راستے پر بچھا رکھے ہیں دام اپنے قضا نے
ادھر وہ مصیبت کے ساتھی ملائے ہوئے سینگوں سے سینگ شانوں سے شانے
رواں ہیں نجانے
کدھر؟ کس ٹھکانے؟
نہ رُکنے کی تاب اور نہ چلنے کا یارا
مقدر بنیارا (۱۰)

اس ضمن میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری رقم طراز ہیں:

''جسمانی عمل کے اعتبار سے امجد نے ہالی کو بیل کی شکل میں دیکھا ہے۔

اس کے نزدیک یہ تہذیبی تاریخ ہزار برس سے انسانوں کو بیلوں میں متشکل ہوتا دیکھ رہی ہے۔شکلوں کے بدلنے میں اک تسلسل ہے۔ جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ ہڑپہ کی تہذیب دو بیلوں کی نہیں، یہ تین بیلوں کی تہذیب ہے۔ ہڑپہ کی تہذیب مر گئی، دفن ہو گئی، مگر تین بیلوں کی یہ مسلسل تہذیب زندہ ہے اور امجد اسی تہذیبی تسلسل کے چہرے سے دکھوں کی ریکھاؤں کے مٹنے کا منتظر ہے۔'' (۱۱)

کسی نے بہت خوب کہا ہے کہ اگر کسان جو زمین کی زرخیزی کو خوراک کی دولت میں ڈھال دیتا ہے، نکال دیا جائے تو انسانی تمدن کی فلک بوس عمارت چشم زدن میں زمین پر آ رہے۔ شاید کسان ہی کی طرف دیکھتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا تھا کہ مجھے اہلِ دیہات کی غربت اور مفلوک الحالی دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے۔ پاکستانی حکومت کا سب سے پہلا یہ کام ہوگا کہ ان کا معیارِ زندگی بلند کرے۔ میں ایسا پاکستان حاصل کرنے میں، کوئی دل چسپی نہیں رکھتا جہاں عوام کی فلاح و بہبود کا کام حقیقت کا روپ نہ دھار سکے۔ مجید امجد کی اس نظم کو قائد کے فرمان اور ملک کی موجودہ صورتِ حال کے تناظر میں بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کیوں کہ پاکستان ایسے زرعی ملک میں، جس کی ستر فیصد آمدن کا انحصار آج بھی زراعت پر ہے، کسان ایک ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک ہم کسان کے لیے آسانیاں پیدا نہیں کریں گے، ہم ایک زرعی ملک رکھنے کے باوجود بھی بہت سی اجناس درآمد کرنے پر مجبور رہوں گے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' مسمط کی شکل، مثلث کی ہیت میں ہے۔ یہ نظم تین بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند کے تین مصرعے ہیں۔ پھر پہلے بند میں تین ہزار برس پرانی تہذیب کا ذکر اور آخری بند میں تین بیل کے الفاظ محض حسنِ اتفاق نہیں بلکہ حسنِ اہتمام ہے۔

چوں کہ مجید امجد کے ہاں موضوعات کے ساتھ ساتھ بحروں میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ اس لیے وہ اکثر ہندی کی بحریں سرسی اور سار چھند استعمال کرتے ہیں۔ اس نظم میں بھی انھوں نے ہندی بحر سرسی استعمال کی ہے۔ ہندی کی یہ بحر ہمارے ہاں مستعمل بحر متدارک مقطوع کے مماثل

قرار دی جا سکتی ہے اور اس نظم میں اس کے ارکان کی ترتیب کچھ یوں بنتی ہے۔

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع / فاع

مجید امجد نے ہندی بحر کی مناسبت سے ہندی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ تٹ، چھل بل، جیوٹ جوڑی، رکھ اور لیکھ کے الفاظ ہندی اسلوب کی نشان دہی کرتے ہیں۔

مجید امجد کی نظمیں بدیع و بیان کی خوب صورتی سے بھی مزین ہوتی ہیں۔ اس نظم میں خداؤں کا استعارہ جاگیرداروں کے لیے اور بیل کا استعارہ کسان کے لیے استعمال کیا ہے۔ پہلے بند میں کھیت، پھول، پھل، کسان، ہل اور بیلوں کے تذکرے سے صنعت مراعات النظیر استعمال کی ہے۔ اسی بند میں تین ہزار، دو بیلوں، اک ہالی، اک ہل اور آخری بند میں تین بیل کے الفاظ صنعت سیاقۃ الاعداد کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' فکر و فن کے اعتبار سے مجید امجد کی ایک خوب صورت نظم ہے۔

حوالہ جات و حواشی

(۱) اقبال، محمد، علامہ۔ کلیاتِ اقبال۔ لاہور: ادارۂ اہلِ قلم، ۲۰۰۵ء۔ ص ۶۶۳

(۲) خالد، تصدق حسین، ڈاکٹر۔ سرودِ نو۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء

(۳) Anthony. C. Winkler. "Poetry as system." London: Scott, Foresman and Company, N.D. p: 16.

(۴) خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر۔ ''خاکہ (مجید امجد)'' مشمولہ دستاویز: مجید امجد نمبر۔ راول پنڈی: قاضی پرنٹرز، گوال منڈی، ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۱

(۵) مجید امجد۔ کلیاتِ مجید امجد۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔ ص ۲۲۲

(۶) ایضاً۔ ص ۵۶، (۷) ایضاً۔ ص ۳۰۶، (۸) اقبال، محمد، علامہ۔ کلیاتِ اقبال۔ ص ۴۳۶

(۹) غالب، اسد اللہ خاں، مرزا۔ دیوانِ غالب۔ دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۷ء۔ ص ۸۳

(۱۰) مجید امجد۔ کلیاتِ مجید امجد۔ ص ۵۹

(۱۱) تبسم کاشمیری، ڈاکٹر ''مجید امجد: آشوبِ زیست اور مقامی وجود کا تجزیہ'' مشمولہ دستاویز، مجید امجد نمبر ص ۲۵۹

❁❁❁